خلافت عثمانیہ کے خاتمے پر مسلم ہندوستان کا ردِ عمل

ابو الکلام آزاد، علامہ محمد اقبال اور مولانا برکت اللہ بھوپالی

Response of Muslim India to the end of Ottoman Caliphate Abul Kalam Azad, Muhammad Iqbal, and Maulana Barkatullah Bhupali

Dr Shahid Rasheed
Assistant Professor Department of Sociology, FC College University, Lahore
Email: shahidrasheed@fccollege.edu.pk

Abstract:
This paper seeks to capture some of the most important responses from Muslim India to the and of Ottoman Caliphate. These responses are from Maulana Abul Kalam Azad, Dr. Muhammad Iqbal and Maulana Barkatullah Bhopali In 1924 when the caliphate was abolished, Indian Muslims were shocked. Allegiance to the caliphate had become the center of their religio-political worldview. They were upset by the tide of nationalist forces sweeping away the caliphate. Deputation was send to Turkey by the Khilafat Conference but to the utter dismay of Indian Muslims, the Turkish republic refused to receive the Indian delegation. A new kind of political consciousness developed in Muslim India after the Khilafat movement in which both Indian nationalism and Muslim nationalism flourished. Three major Muslim voices who tried to rebuild Muslim confidence have been discussed in this article.
Keywords: Maulana Azad, Iqbal, Maulana Barkatullah, Political Modernity, Nationalism, Muslim India, South Asia, Khilafat

مسلم ہندوستان اور خلافت عثمانیہ کا رشتہ پندرہویں صدی عیسوی ہی میں قائم ہو چکا تھا لیکن انیسویں صدی کے اواخر سے اس تعلق میں ایک نئی قوت پیدا ہوئی۔ مغربی اقوام کے بڑھتے ہوئے نو آبادیاتی نظام کے پس منظر میں خلافت عثمانیہ عالمِ اسلام کے لیے سیاسی قوت کی ایک روشن علامت کے طور پر سامنے آتی ہے، سلطان یعنی خلیفہ کو تمام مسلمانوں کا محافظ مانا گیا۔ اس حقیقت نے کہ اب ہندوستان بھی برطانیہ کے زیرِ نگیں تھا، ہندوستان کے مسلمانوں کے دل و دماغ میں خلافت عثمانیہ کے لیے ایک نئی اہمیت پیدا کی۔ سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں بھی ایسی مثالیں ملتی ہیں جب ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں نے اپنی حفاظت کے لیے خلافت عثمانیہ سے مدد طلب کی، لیکن انیسویں صدی میں یہ

رشتہ خصوصی اہمیت اختیار کر گیا[1]۔ مسلمانانِ ہند کے لیے یہ امر نفسیاتی تسکین کا بھی باعث تھا کہ خلافتِ عثمانیہ کی عظمت اور سیاسی قوت یورپی اقوام کے ہم پلہ ہے۔ لہٰذا جب یورپی اقوام نے سلطنت عثمانیہ کو کمزور کرنے کی کوشش کی، تو ان کوششوں کو ہندوستانی مسلمانوں نے نہایت غم و غصے کی کیفیت سے دیکھا اور یہ محسوس کیا گویا مغربی اقوام ان کی اُمید کا آخری چراغ بھی بجھانے کے در پے ہیں۔ لہٰذا انیسویں صدی کے اواخر میں سلطنت عثمانیہ کے لیے یگانگت اور بھائی چارے کے جذبات مسلم ہندوستان کی مذہبی وسیاسی فکر کا ایک اہم پہلو ہیں۔ نشر و اشاعت کے جدید ذرائع نے ان جذبات کو اور بھی تقویت دی۔ لہٰذا بہت سے اخبارات اور رسائل سلطنت عثمانیہ کی خبروں کے لیے مستقل صفحات اور اداریے وقف کرتے تھے اور اس کے نتیجے میں مسلم ہندوستان میں انیسویں صدی میں ایک نیا سیاسی شعور پیدا ہوا۔ ان اخبارات اور رسائل میں جامِ جہاں نما(کلکتہ)، دہلی اردو اخبار(دہلی)، کوہِ نور(لاہور)، سید الاخبار(دہلی)، اودھ اخبار(لکھنؤ)، اودھ پنچ(لکھنؤ)، اور پیسہ اخبار(لاہور) خصوصی طور پر اہم ہیں۔ جیسے جیسے مغربی اقوام کی سلطنت عثمانیہ کی طرف جارحیت میں اضافہ ہوتا گیا، ویسے ویسے مسلم ہندوستان کے سلطنت عثمانیہ کے لیے جذبات میں شدت آتی گئی[2]۔ یہ جذبات دو شکلوں میں ظاہر ہوئے۔ ایک تو ایسی تنظیمات کی تشکیل کی گئی جو عثمانیوں کو مالی امداد فراہم کرنے کے لیے چندہ اکٹھا کرتیں اور دوسرے، مختلف جماعتیں برطانوی پارلیمنٹ اور ملکۂ برطانیہ کے نام قراردادیں بھجواتیں۔ اس سلسلے میں نواب عبداللطیف (1828ء–1893ء) اور سید امیر علی (1849ء–1928ء) نے کوشش کی کہ برطانوی حکومت کو ہندوستانی مسلمانوں کے لیے خلافت عثمانیہ کی اہمیت سے آگاہ کریں۔

جب روس نے 1877ء میں عثمانیوں پر حملہ کیا تو ہندوستانی مسلمانوں نے مختلف پٹیشنز کے ذریعے حکومت برطانیہ کو اپنے خیالات سے آگاہ کیا لیکن حکومت برطانیہ نے اس موقع پر سلطنت عثمانیہ اور روس کے درمیان آویزش میں غیر جانب دار رہنے کا فیصلہ کیا۔ اس موقع پر ہندوستان سے بہت سی مسلمان تنظیموں نے ترکی میں اپنے رضاکار بھیجے تاکہ وہ روس کے خلاف جنگ میں شریک ہو سکیں اور ترکی کے لیے مالی امداد بھی فراہم کی۔ اس جنگ میں ترکی کی شکست نے مسلمانوں کو بہت صدمہ پہنچایا اور وہ اس کا ذمہ دار برطانوی حکومت کو سمجھتے تھے جس نے اس جنگ میں غیر جانب دار رہ کر مسلمانوں کے احساسات سے بے اعتنائی کا ثبوت دیا تھا۔ عثمانی خلیفہ نے ہندوستانی مسلمانوں کی امداد اور تعاون کو بہت سراہا اور بہت سے اخبارات، شخصیات اور تنظیموں کو خلافتِ عثمانیہ کی طرف سے اعزازات سے نوازا گیا۔ جب 1897ء میں سلطنتِ عثمانیہ نے یونان کی فوج کو شکست دی تو ہندوستانی مسلمانوں نے اس فتح پر خوشی کا اظہار کیا[3]۔

انیسویں صدی کے اواخر ہی میں خود سلطنت عثمانیہ میں دھیرے دھیرے ایک تبدیلی آ رہی تھی اور وہ یہ کہ عثمانی خلیفہ ترکی کے بہت سے جدید دانشوروں کے حلقوں میں بہت تیزی سے اپنی مقبولیت کھو رہے تھے۔ یہ دانشور ترک

قومیت کی بنیاد پر اپنی قوم کی آزادی کی تحریک کو منظم کرنا چاہتے تھے۔ اسی سوچ کے نتیجے میں بالآخر ینگ ٹرکس (Young Turks) کی تنظیم وجود میں آئی۔ ینگ ٹرکس بنیادی طور پر آئین کی بالادستی کے خواہاں تھے، لہٰذا 1908ء میں ینگ ٹرکس نے خلیفہ وقت کو مجبور کیا کہ وہ آئین کو بحال کرے اور ایک سال بعد انہوں نے خلیفہ عبدالحمید ثانی کو معزول کر دیا اور ایک نئے خلیفہ کو منصب خلافت پر فائز کر دیا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران برطانیہ اور سلطنت عثمانیہ مخالف کیمپوں میں چلے گئے۔ سلطنت عثمانیہ کے وزیر دفاع انور پاشا نے ہندوستانیوں پر زور دیا کہ وہ برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کر دیں[4]۔ اس بغاوت کے خوف سے برطانوی حکومت نے صورتحال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے ایک اعلامیہ جاری کیا کہ اسلام کے مقدس مقامات کی حفاظت کی جائے گی۔ مسلمانوں نے سلطنت عثمانیہ کو بچانے کے لیے مرکزی خلافت کمیٹی قائم کی اور ایک پوری تحریک شروع ہوئی جسے تحریک خلافت کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس تحریک میں ہندوؤں نے بھی مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ برطانوی حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لیے مسلمان علماء اور رہنماؤں کے بہت سے وفد انگلستان گئے۔ جنگ کے خاتمے پر اتحادیوں نے سیورے کے معاہدے کے ذریعے سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کرنے کا فیصلہ کیا۔ قوم پرست ترکوں نے بہت سے مقامات پر اتحادی فوجوں کو شکست دی اور ترکی کی سالمیت برقرار رکھی، اگرچہ خلافت عثمانیہ کے بہت سے علاقے اُن کے ہاتھ سے نکل گئے۔ ترکی کی اس نئی قیادت نے بالآخر 3 مارچ 1924ء کو خلافت کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔

1924ء میں جب خلافت کا خاتمہ ہوا تو ہندوستانی مسلمان گہرے صدمے سے دوچار ہوئے۔ خلافت کا ادارہ ان کے مذہبی اور سیاسی نقطہ نظر کا مرکز بن چکا تھا۔ وہ قوم پرست قوتوں کی جانب سے خلافت کے خاتمہ سے پریشان تھے۔ خلافت کانفرنس کی طرف سے ایک وفد ترکی بھیجا گیا تھا لیکن ہندوستانی مسلمانوں کو اس وقت شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑا جب ترکی نے ہندوستانی وفد کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ عوامی اجتماع کے پُرتشدد مزاج کو دیکھ کر گاندھی پہلے ہی تحریک سے دستبردار ہو چکے تھے۔ تحریک خلافت[5] کے بعد مسلم ہندوستان میں ایک نئی قسم کے سیاسی شعور نے جنم لیا جس میں ہندوستانی قومیت اور مسلم قومیت دونوں پروان چڑھے۔

خلافت کے خاتمے پر مولانا آزاد کا ردعمل علی برادران اور دیگر جذباتی رہنماؤں سے بالکل مختلف تھا۔ وہ گہرے تاریخی شعور کے حامل تھے۔ اور اگرچہ، انھوں نے خلافت کی فکری بنیاد کو قرآن اور حدیث سے ثابت کیا تھا، لیکن خلافتِ عثمانیہ کے لیے ان کی بنیادی دلیل کی بنیاد تاریخ کے بارے میں ان کی عملی تفہیم میں پیوست تھی کہ سلطنتِ عثمانیہ صدیوں سے ایک مؤثر خلافت قائم کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ وہ خلافت کے خاتمے سے پریشان نہیں تھے کیونکہ اُن کے خیال میں خلافت سے مراد دراصل مؤثر اسلامی حکومت ہے اور اس کے لیے لفظ "خلافت" استعمال کیے بغیر بھی اسے قائم رکھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اسلامی خلافت کلیسیا اور پاپائیت کی طرح نہیں ہے۔ لہٰذا خلافت کا جوہر اور

حقیقت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے کبھی ختم کیا جاسکے۔ 1924ء کے موسم بہار میں زمیندار[6] میں شائع ہونے والے مضامین میں، انھوں نے اپنے نقطہ نظر کو واضح اور معروضی طور پر بیان کیا کہ کوئی بھی مؤثر اور طاقتور اسلامی حکومت اپنی فطرت کے لحاظ سے خلافت ہی ہے۔ چاہے یہ ترکی ہو یا کوئی اور ملک۔ اس طرح انھوں نے اتاترک کے ہاتھوں خلافت کے خاتمے کے مسئلے کو زیادہ اہمیت نہ دی اور خلافت کمیٹی اور ہندوستانی مسلمانوں کی توجہ مسلم برادری کی سماجی و اقتصادی ترقی اور ہندوستان کی آزادی کے اصل مقصد کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی۔ انھوں نے واضح کیا کہ خلافت کو حقیقی معنوں میں کبھی ختم نہیں کیا جاسکتا اور لفظ "خلافتِ عثمانیہ" سے چمٹے رہنے اور مسلم ہندوستان کو درپیش اصل مسئلے کو نظر انداز کرنا بے سود ہے۔ مولانا آزاد نے اس بات پر بھی زور دیا کہ ترکی میں آئینی تبدیلیوں اور اس کے جمہوری طرز عمل کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ اسلامی خلافت کا وجود ختم ہو گیا ہے۔ ترکی اب بھی ایک مسلم ملک ہے اور اس کا جمہوری طرزِ عمل بھی اسلامی طرزِ حکومت کی خصوصیات سے ہم آہنگ ہے۔ خلافت کے خاتمے کا اعلان صرف ترکی کے سیاسی نظام میں تبدیلی کی نشاندہی کرتا ہے۔ اُن کی رائے میں خلیفہ کا مطلب ریاست کا سربراہ ہے اور سلطنت سے خلافت کو علیحدہ کرنا، جیسا کہ پہلے سلطنتِ عثمانیہ نے کیا تھا، اسلامی سیاسی رجحان کے مطابق نہیں تھا کیونکہ اس نظام میں خلیفہ محض پوپ کی طرح روحانی سربراہ ہوتا جس کو کوئی حقیقی طاقت حاصل نہ ہوتی۔ لہٰذا، خلافت کا خاتمہ اِس غلطی کی اصلاح ہے کیونکہ اگرچہ کوئی "خلیفہ" نہیں ہوگا لیکن جمہوری ریاست کے سربراہ کی صورت میں ایک حقیقی خلیفہ موجود ہوگا[7]۔

ابوالکلام آزاد کا خیال تھا کہ خلفائے راشدین کے دور تک اسلامی نظام کا جوہر برقرار رہا اور اسلامی جمہوریت اپنی کارگزاری میں بطریقِ احسن رواں دواں رہی۔ خلیفہ اپنے طرزِ زندگی میں ایک عام آدمی کی طرح ہوتا تھا۔ وہ کسی مسئلے کے حل کے لیے مہاجرین و انصار میں سے اور بعض اوقات پوری برادری کے دانا لوگوں سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ آزاد کا یہ بھی کہنا تھا کہ اسلام ظلم اور استبداد کے خلاف جدوجہد پر زور دیتا ہے، چاہے حکمران مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔ جب حکمران مسلمان ہوں تو یہ سیاسی جدوجہد پُر تشدد شکل میں نہیں ہونی چاہیے جیسا کہ ابتدائی مفسرینِ قانون کا خیال ہے لیکن احتجاج ہر حال میں جاری رہنا چاہیے[8]۔ مولانا ابوالکلام آزاد بیوروکریٹس کی حکمرانی کے بھی خلاف تھے جو ریاست کے تنخواہ دار اہلکار ہیں کیونکہ ایسا انتظام بھی اسلام کی جمہوری روح کے خلاف ہے[9]۔ یوں آزاد کے اندازِ فکر میں مارشل لاء کی کوئی گنجائش نہیں ہے چاہے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ایک متقی مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اگر اسلام کسی مسلمان بادشاہ کے زیرِ حکومت بادشاہت کے نظام کو بھی قبول نہیں کرتا تو وہ کسی غیر ملکی حکومت کے تسلط کو کیسے قبول کر سکتا ہے۔ اُن کے مطابق نہ تو پیغمبرِ اسلام ﷺ نے اور نہ ہی پہلے خلفاء نے اپنے بیٹوں یا قریبی رشتہ داروں کو اپنے بعد مقرر

کیا۔ ہر موقع پر ہمیشہ عام مشاورت ہوتی تھی۔ بیت المال (مرکزی خزانہ) عوام کی ملکیت تھی۔ قانون کے سامنے برابری کا رواج تھا۔ اس طرح اسلامی سیاسی کلچر اپنی روح میں جمہوری تھا۔

خلافت کے خاتمے پر ایک اہم ردِ عمل جواب مولانا برکت اللہ بھوپالی (1854-1927) کی طرف سے آیا جو پہلی جنگِ عظیم کے دور کے آس پاس انقلابی سیاست میں بہت زیادہ متحرک تھے۔ انھوں نے 1925ء میں خلافت پر ایک مقالہ لکھا۔ مولانا برکت اللہ نے سلطان عبد الحمید اور سلطان وحید الدین کو غاصب قرار دیا جو اپنے ذاتی مفادات کے لیے محب وطن ترک مسلح افواج کے خلاف کام کر رہے تھے اور انگورا کی گرینڈ نیشنل اسمبلی کی جانب سے خلافت کے خاتمے کا سبب یہی تھا۔ مولانا برکت اللہ کے مطابق خلافت ایک روحانی ادارہ ہے جبکہ سلطنت ایک دنیوی ادارہ ہے، اور ان دونوں کو ملانا دُرست نہیں ہے کیونکہ اس امتزاج نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور پہلے چار خلفائے راشدین کے دور کے علاوہ ہمیشہ استبداد کو جنم دیا ہے۔ لہٰذا، سلطنت اور خلافت کو الگ کرنا اور پھر خلافت کو یکسر ختم کرنا ایک دانشمندانہ فیصلہ تھا۔ مزید بر آں، مولانا برکت اللہ کا مؤقف تھا کہ ایک ایسے دور میں مسلم ممالک پر خلافت قائم کرنا انتہائی ناقابلِ عمل ہو جس میں مسلمان سیاسی طور پر غلام اور معاشی طور پر غریب ہیں۔ کوئی بھی مسلمان ملک چاہے وہ مصر ہو، ترکی، حجاز ہو یا یمن اس دور میں خلافت کے نظام کو برقرار نہیں رکھ سکتا[10]۔ برکت اللہ کے مطابق، عالمِ اسلام کے سیاسی اتفاق اور اسلامی اتحاد کا نظریہ جدید دور کی روح اور جدید رائے عامہ کے برخلاف ہے۔ تاہم مولانا برکت اللہ کی رائے میں مسلم ممالک کو ایک روحانی باپ کے تحت متحد کرنا ممکن ہے اور یہی خلافت کا حقیقی مفہوم ہے۔ اسلام میں خلافت کے مفہوم کی مزید وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دنیوی حکومت کی تنظیم بنی اسرائیل میں قاضیوں کی حکومت کی طرح ہے جبکہ روحانی تنظیم عیسیٰ علیہ السلام کے معیار کے مطابق نسل یا رنگ کی تفریق کے بغیر انسانوں کی مساوات پر مبنی تھی۔ لہٰذا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا بنیادی معیار یہ تھا کہ روح اور سچائی کی طاقت سے زمین پر خدا کی بادشاہی قائم کی جائے[11]۔

مولانا برکت اللہ کے مطابق، بنی نوع انسان کے لیے بنیادی ادارہ رسالت ہے جس کا مقصد آدم اور حوا کے بیٹوں اور بیٹیوں تک الٰہی پیغام پہنچانا ہے۔ خلافت کا ادارہ رسالت کا جانشین ہے اور اس طرح یہ آنے والے وقتوں کے لیے بنی نوع انسان تک الٰہی پیغام پہنچانے کا ادارہ ہے۔ لہٰذا، خلیفہ کا عہدہ ایک روحانی عہدہ ہے اور عالمِ اسلام کے روحانی سربراہ کی حیثیت سے اسے سیاسی معاملات میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ "اس لیے یہ مناسب ہے کہ پیغمبر ﷺ کا جانشین اپنا سارا وقت، توانائی اور توجہ اپنے مقدس عہدے یعنی اسلامی دنیا کی روحانی خدمت کی ناگزیر ذمہ داری پر صرف کرے اور سیاست سے مکمل طور پر کنارہ کشی کرلے۔ قرآن پاک کا فرمان ہے، "خدا کا دین خالص ہے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا

کا مذہب سیاسی تعصبات، نسلی حدود، خود غرضی کے مقاصد اور جنونی توہمات سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ یہ اتنا وسیع ہے کہ پوری انسانیت کو اپنی روحانی نگرانی میں شامل کر سکتا ہے[12]۔

مولانا برکت اللہ کی رائے میں مسلم دنیا کے روحانی سربراہ کی حیثیت سے خلیفہ کی اپنی انتظامیہ ہونی چاہیے۔ خلیفہ کی مجلسِ عالیہ ہونی چاہیے جس کا صدر خود خلیفہ ہو۔ یہ مجلسِ عالیہ تمام مسلم ممالک کے ایسے ارکان پر مشتمل ہو جو مذہب، فلسفہ، سائنس اور تاریخ کا گہرا علم رکھنے والے باشعور علما ہوں اور مستقبل کے خلفاء کا انتخاب کریں۔ خلیفہ کے اپنے درج ذیل محکمے ہونے چاہیئں:

محکمہ دین، جس کے ذریعے مساجد کا نظام ترتیب دیا جائے گا اور مساجد معاشرے کی اخلاقی، مذہبی اور روحانی بہبود کے مراکز ہوں گی۔

محکمہ مالیات یا بیت المال زکوٰۃ جمع کرے گا اور مسلم دنیا کے غریبوں، یتیموں، بیواؤں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کرے گا۔

محکمہ تعلیم و تحقیق پوری مسلم دنیا میں تعلیم اور تحقیق کا اہتمام کرے گا۔

شعبہ دعوۃ عالمی سطح پر اسلام کی تبلیغ کرے گا۔

مولانا برکت اللہ کے مطابق اُن کا وضع کردہ خلافت کا نظام جدید دنیا میں عملی ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام میں خلافت کے حقیقی مفہوم سے ہم آہنگ بھی ہے۔

علامہ اقبال نے بھی خلافت کے خاتمے کو وقت کی ضرورت قرار دیا۔ خلافت کا وجود اُس زمانے میں یقیناً اہمیت کا حامل تھا جب اسلامی سلطنت برقرار تھی۔ جدید دور میں یہ آزاد مسلم ریاستوں کے دوبارہ اتحاد کی راہ میں رکاوٹ بن گیا ہے۔ اقبال کی رائے میں یہ ترکوں کا اجتہاد تھا کہ خلافت ایک شخص کے بجائے لوگوں کی مجلس کی شکل میں قائم کی جاسکتی ہے۔ لہٰذا "جمہوری طرزِ حکومت نہ صرف اسلام کی روح سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے بلکہ عالمِ اسلام میں آزاد ہونے والی نئی قوتوں کے پیشِ نظر ایک ضرورت بن چکا ہے[13]"۔

اقبال کے مطابق ابتدائی سیاسی نظریہ سازوں کے کاموں میں ایسی نظیریں موجود ہیں جن میں انھوں نے اسلامی سیاسی رجحان کی تشریح کے لیے علمی استدلال کے بجائے "زمینی حقائق کی سخت منطق" کو تسلیم کیا۔ قاضی ابو بکر باقلانی اور ابن خلدون دونوں نے قریش کے سیاسی زوال کا باعث بننے والے "تجربہ کے حقائق" کی وجہ سے "قریشیت" کی شرط کو ترک کرنے کی ضرورت کو تسلیم کیا۔ اقبال کا کہنا تھا کہ ترکوں کا مؤقف ابن خلدون کے فکری رجحان سے مختلف نہیں ہے جو معروضیت کے اصول پر مبنی ہے[14]۔

حوالہ جات

[1] Azmi Ozcan, Pan-Islamism: Indian Muslims, the Ottomans and Britain (1877–1924). Leiden: E.J. Brill 1997.

[2] ایضاً

[3] ایضاً

[4] ایضاً

[5] تحریک خلافت پر اہم مطالعات میں:

Movement include Gail Minault, The Khilafat Movement: Religious Symbolism and Political Mobilization in India. New York: Columbia University Press, 1982. ; Naeem Qureshi, Pan-Islam in British Indian Politics: A Study of the Khilafat Movement, 1918-1924. Leiden: Brill, 1999. K. H. Ansari, 'Pan-Islam and the Making of the Early Indian Muslim Socialists', Modern Asian Studies 20, no. 3 (1986): 509-37.

[6] مقالہ 'مسئلہ خلافت اور جمہوریہ ترکیہ عن نبا العظیم' سات حصوں میں زمیندار اخبار میں شائع ہوا اور بعد میں مولانا غلام رسول مہر نے اسے اپنی تصنیف 'تبرکاتِ آزاد' میں مرتب کیا۔ دہلی: ادبی دنیا، 1963۔ صفحات۔ 173-216۔ آن لائن دستیاب ہے:

https://www.rekhta.org/ebooks/tabarrukat-e-aazad-ghulam-rasool-mehar-ebooks (Accessed on 21st March 2020)

[7] آزاد، ابوالکلام، مولانا، "مسئلۂ خلافت اور جمہوریہ ترکیہ النباء العظیم" در تبرکات آزاد، دہلی: ادبی دنیا، 1963ء۔

[8] آزاد، ابوالکلام، مولانا، مولانا ابوالکلام آزاد کا مکمل مقدمہ مع مفصل تحریری بیان، دہلی: حمیدیہ پریس، تاریخ ندارد۔

[9] Siddiqi, Mazheruddin. Modern Reformist Thought in the Muslim World. Kazi Publications, 1991.

[10] Barakatullah, Muhammad. The Khilafat. Lahore: Republican Books, 1989.

[11] ایضاً

[12] ایضاً

[13] Iqbal, Allama Muhammad. The Reconstruction of Religious Thought in Islam. Lahore: Iqbal Academy Pakistan, 1989.

[14] ایضاً